جولائی کا مہینہ دھیرے دھیرے قریب آتا جا رہا ہے۔ ابن صفی کی یادوں کا قرض جاں سر پر سوار ہے۔ اپنی کوتاہی کا احساس ہے کہ کئی برس سے اس یار طرح دار کی بارگاہ' نیاز میں حاضری نہیں دے سکا۔ ادھر عزیزم مشتاق سلمہ بھی کئی مرتبہ توجہ دلا چکے ہیں بلکہ اظہر کلیم نمبر میں میری فرمائش پوری کرتے ہوئے مجھ سے ابن صفی کے بارے میں یادداشتیں لکھنے کی جوابی فرمائش بھی کر چکے ہیں مگر میں بھی کیا کروں کہ عمر نے حافظے پر نسیاں کے کہر کا کچھ ایسا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے کہ اب خود سے کوئی بات یاد نہیں آتی۔ خصوصاً" اس وقت جب لکھنے بیٹھوں۔ ویسے تو حافظہ اس یارِ دلنواز کی یادوں سے ابلتا رہتا ہے مگر جب لکھنا چاہوں تو سادہ ورق ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی یاد دلا دے یا کسی موقعے کی مناسبت نصیب ہو جائے تو وہ ساری باتیں حافظہ میں کچھ ایسے روشن ہو جاتی ہیں جیسے بادل کو پھاڑ کر چاند نکل آتا ہے۔ یوں تو یہ صحیح ہے کہ ابن صفی کا اور میرا کم و بیش تقریباً" اٹھائیس سال کا ساتھ رہا ہے اور اس عرصے میں ان سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ملاقاتیں رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ہم شریک رہے ہیں۔ کبھی ہم نے گھنٹوں ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے سے دنیا جہاں کی باتیں کی ہیں اور کبھی پہروں ایک دوسرے کی خاموشی کا بھی لطف اٹھایا ہے مگر یہ توقع یا خدشہ کس کو تھا کہ کبھی ہم جدا بھی ہو جائیں گے اور جدائی بھی ایسی کہ جو قیامت تک دائمی جدائی ہے۔ ہاں اگر کبھی بھولے سے بھی اس فراق کا احساس ہو جاتا تو ان باتوں کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے بلکہ لکھ ہی لیتے۔ اب تو وہ ساری باتیں ایک بھولی ہوئی خوشبو کی طرح یاد ہیں اور خوشبو کو کون لفظوں میں بیان کر سکا ہے۔ پھولوں کو سونگھا تو سب ہی نے ہو گا اور خوشبو کا لطف بھی اٹھایا ہو گا مگر پوچھا جائے کہ وہ خوشبو کیا تھی تو سوائے مشامِ جاں معطر ہو جانے کے احساس کے اور کچھ بھی نہ کہا جا سکے گا تو میں بھی ابن صفی کی بھولی ہوئی یادوں کی چند جھلکیاں پیش کر کے آپ کے مشامِ جاں کو معطر کرنے کی کوشش کروں گا کہ شاید اس خوشبو کے ہالے میں آپ کو بھی اس یارِ عزیز کا چہرہ نظر آ جائے اور کوئی تصویر بن جائے۔

✦

ابن صفی کا شاعرانہ ذوق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اگرچہ بدقسمتی سے ان کا دیوان ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا کہ (اے کاش کہ وہ میری زندگی ہی میں چھپ جائے اور میری بجھتی ہوئی پیاسی آنکھیں اس کا دیدار کر کے تسکین پا سکیں) مگر نئے افق کے اوراق کے ذریعے ان کے کلام کا خاصا بڑا حصہ چھپ چکا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ لوگ جس طرح نئے افق میں ان کا ناول اور تزک دو پیازی ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے اسی طرح ان کے صفحہ دل کے بھی مشتاق رہتے تھے۔ سچ پوچھا جائے تو ابن صفی کے ادبی سفر کی ابتدا ہی شاعری سے شروع ہوئی۔ طنز نگاری' مزاح نگاری اور سراغ نگاری سب ان کے نقشِ ثانی ہیں سب سے پہلے وہ اسرار ناروی کے نام سے ہی بحیثیت شاعر منظرِ عام پر آئے تھے' طفرل فرغان' سنکی سولجر' عقرب بہار ستانی اور ابن صفی کے چہرے انہوں نے حسبِ ضرورت بعد میں اپنے چہرے پر چڑھائے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن صفی کے نام نے وہ لازوال شہرت حاصل کر لی کہ باقی سارے نام ماند پڑ گئے۔ یہ قبولِ عام خدا تعالیٰ کی دین ہے اس پر کسی کا اجارا نہیں اور نہ کوئی بزورِ قوت بازو اسے حاصل کر سکتا ہے بہرحال ابن صفی بنیادی طور پر شاعر تھے اور ساری عمر وہ کبھی اپنے شاعر ہونے پر شرمندہ نہیں ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ مشاعرہ باز نہ ہونے کی وجہ سے اور انجمن ہائے تحسینِ باہمی کے ممبر نہ بننے کے باعث وہ

اپنی شاعرانہ حیثیت میں زیادہ مشہور نہیں ہو سکے مگر ان کا ذوق سخن بے حد اعلیٰ تھا جس کا اظہار ان کی غزلوں اور نظموں سے ہوتا ہے۔ یہاں میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ایک بے پناہ نظم "ہوشربا" کا ذکر کرنا چاہوں گا جو مولانا حالی کے لافانی مسدس اور علامہ اقبال کی طلوع اسلام کے قبیلے کی نظم ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم کا دیوان چھپنے کے بعد اس نظم کی عظمت اہل نظر سے چھپی نہیں رہے گی۔ تو جیسا کہ میں عرض کر رہا تھا کہ مرحوم بنیادی طور پر شاعر تھے وہ جیسی خوبصورت نظمیں اور غزلیں کہتے تھے اسی پائے کے برجستہ گو طنز نگار بھی تھے اور اس فن میں انہوں نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ اکثر کسی اچانک واقعے کی مناسبت سے ایسا طنز میں ڈوبا ہوا شعر کہہ جاتے کہ سننے والے پھڑک کر رہ جاتے تھے۔ افسوس کہ ان گنج ہائے گرانمایہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ورنہ خاصے کی چیز اور ادب کی آبرو ہوتے۔ ایسا ہی ایک شعر جو اتفاقاً" حافظے میں محفوظ رہ گیا ہے آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

۷۹ء کا زمانہ تھا۔ جنرل ضیاء کے انقلاب کو دو برس گزر چکے تھے۔ ابن صفی کے دفتر میں اچھا خاصا جمگھٹا تھا اسی دن بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر آئی تھی جو اس دن کی گرم ترین خبر تھی۔ لہٰذا ابن صفی کے دفتر میں بھی میں خبر گرما گرم . . .

گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی حاضرین میں بھٹو مرحوم کے حامی بھی تھے اور جنرل ضیا کے بھی جن لوگوں نے وہ دور دیکھا ہے وہ اس تلخی کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جو اس گفتگو میں تھی ابن صفی خاموش بیٹھے سب کی سنتے رہے مگر جب گفتگو حد سے گزرنے لگی تو مرحوم خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے ان کے اس طرح اچانک اٹھ کھڑے ہونے سے محفل بھی درہم برہم ہو گئی مرحوم نے اسی خاموشی کے ساتھ دفتر بند کیا اور گھر کی طرف چل پڑے میں ہمراہ تھا تھوڑی دیر تک خیالوں میں ڈوبے ہوئے گم صم چلتے رہے پھر اچانک میری طرف مڑے اور آہستہ سے بولے

یہ تو جنگل ہے یہاں ہے کون کس کا آشنا
بھیڑیے نے بھیڑیے کو پھاڑ ڈالا بات ختم

زمانے کا کچھ عجب دستور ہے کہ بعض چیزوں کے نام کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس طرح بدل جاتے ہیں کہ پچھلا نام اجنبی بن جاتا ہے اور نیا نام قبول عام کی سند حاصل کر لیتا ہے بعض اوقات یہ تبدیلی بغیر کسی وجہ کے اپنے آپ ہی ہو جاتی ہے اور کبھی شے مذکور میں کسی تغیر و تبدل کے باعث ہوتی ہے کہنا یہ ہے کہ فاسٹ فوڈ اور برگر کے نام اب پاکستانی شہروں کے لئے ہرگز اجنبی نہیں تھے ہر بڑے پاکستانی شہر میں فاسٹ فوڈ کی درجنوں دکانیں کھلی ہوئی ہیں جہاں برگر بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں حالانکہ ابھی چند سال پہلے دوسرے شہروں کا کیا ذکر خود عروس البلاد کراچی میں کوئی برگر کا نام نہیں جانتا تھا ہاں اس وقت بن کباب ضرور بکتے تھے اور خوب کھائے جاتے تھے مگر انہیں برگر کوئی نہیں کہتا تھا اب انہیں سیدھے سادے بند کبابوں کو سلاد کے پتے کے ایک دو ٹکڑوں اور ٹماٹروں کے ایک آدھ قتلے کے اضافے نے برگر بنا دیا ہے اور برگر بن کر ان کی قدر ہی نہیں قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کا زمانہ تھا ٹھیک سال یاد نہیں غالباً" ۶۲ یا ۶۳ تھا جب پاکستانی قوم پہلے پہل برگر کے لفظ سے آشنا ہوئی اور آشنا کرانے والے تھے مشہور شاعر اور کالم نویس جناب جمیل الدین عالی اور مرحوم ابن انشا اس زمانے میں یہ دونوں حضرات گلڈ کی تشکیل سے فارغ ہو کر غالباً" یونسکو کی دعوت پر یورپ اور امریکہ کے دورے پر گئے تھے اور دونوں حضرات کے سفرنامے بڑے تواتر اور اہتمام سے جنگ کراچی میں چھپ رہے تھے ان سفرناموں میں اور تو جو کچھ تھا سو تھا مگر ان میں تین مغربی کھانوں کے نام بڑے ذوق و شوق سے لئے جا رہے تھے یعنی برگر، اسایچ اور ہاٹ ڈاگز دونوں حضرات کے سفرناموں میں نام تو تینوں کھانوں کے لئے جاتے تھے مگر برگر کا ذکر جتنی شدت اور والہانہ جوش و جذبے سے کیا جاتا تھا باقی دونوں کھانے اس سے محروم تھے۔ ان سفرناموں میں یہ برگر بھی کچھ عجیب قاضی الحاجات قسم کی چیز تھی کہ جب بھی ان سیاح حضرات کو بھوک لگتی تھی اور صاف ظاہر ہے کہ دن میں تین وقت تو لگتی ہی تھی تو سب سے پہلے برگر ڈھونڈا جاتا تھا اور پھر مزے لے لے کر کھایا جاتا تھا مگر صاحب عجیب بے نیازی تو بلکہ اخفا تھا کہ ان کی تحریر میں برگر تو ہوتا تھا مگر بقول مرحوم اکبر الہ آبادی یہ ہرگز نہیں بتایا جاتا تھا کہ کہاں رکھی ہے رونی رات کی یعنی اس برگر کے اجزائے ترکیبی پر بڑی ہوشیاری سے کبھی روشنی نہیں ڈالی جاتی تھی کہ آخر وہ ہے کیا چیز تو جناب اس برگر بازی نے سارے شہر کو الجھا رکھا تھا لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے برگر کے بارے میں پوچھتے تھے تو انکشاف ہوتا تھا کہ جتنا بقراط ایک ہے اتنا ہی بقراط دوسرا بھی ہے ارے سچی بات یہی ہے کہ ابن صفی اور ہم بھی دونوں انہیں بقراطوں میں شامل تھے ہم دونوں میں بار بار موز برگر پر حکیمانہ

گفتگو ہوئی مگر معمہ حل نہ ہو سکا گرمیوں کے دن تھے ایک روز دوپہر کو میں دفتر سے گھر آیا اور کھانے کے انتظار میں کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھو کر پنکھے کے نیچے بیٹھ گیا اچانک دروازے پر ایک کار آکر رکی اور دستک کی آواز آئی بیٹے نے آکر بتایا کہ ابن صفی چچا آئے ہیں مجھے حیرت ہوئی کہ ناوقت کیوں تشریف آوری ہوئی ہے بیٹے سے کہا کہ اندر بلا لو مگر جواب آیا کہ آپ کو بلا رہے ہیں اٹھ کر باہر گیا تو موصوف ڈپٹ کر بولے کہ ایسے ہی کیوں چلے آرہے ہو جاؤ کپڑے بدل کر آؤ دیر ہو رہی ہے عرض کیا کہ بندۂ خدا ابھی دفتر سے آیا ہوں کھانا بھی نہیں کھایا ہے آؤ بیٹھو ابھی چلتے ہیں مگر موصوف نے پہلے کب ہماری سنی تھی جواب سننے ان کا حکم تو نادر شاہی حکم ہوتا تھا لہٰذا کپڑے بھی بدلنا پڑے اور جانا بھی پڑا خیال تھا کسی نشست میں جا رہے ہیں جہاں جانا موصوف بھول گئے تھے اور اب اچانک یاد آیا ہے چنانچہ بطور احتجاج میں بھی خاموش بیٹھا رہا مگر جب گاڑی صدر کی طرف مڑنے لگی تو موصوف کی آنکھیں ہیروں کی طرح جگمگائیں اور چہرے کو ایک چوڑی سی مسکراہٹ میں لپیٹ کر انہوں نے اطلاع دی کہ ہم برگر کھانے جا رہے ہیں میں واقعی اچھل پڑا بولے کہ شاید آج کا اخبار تم نے نہیں پڑھا ہے ورنہ اتنا حیران نہ ہوتے پھر وضاحت سے بتایا کہ صدر میں ایک نیا ریستوران کھلا ہے فلیمنگو نام کا اور ان کی اسپیشلٹی برگر ہے بہرحال ہم دونوں فلیمنگو پہنچے اچھا ائر کنڈیشنڈ ریستوران تھا بیٹھتے ہی برگر اور کافی کا آڈر دیا گیا مگر جب بیرو برگر لے کر آیا تو کچھ نہ پوچھئے کیا حال ہوا ہمارا دونوں نے پہلے برگر کی طرف دیکھا پھر ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور پھر اس بری طرح ہنسے کہ ریستوران کے منیجر کو ہم پر اختلال ذہنی کا گمان ہوا۔ ویسے شکر ہے وہاں اس وقت کوئی ہمارا صورت آشنا موجود نہیں تھا بہرحال اس سانحے کے مہینوں بعد تک ہمارا یہ حال تھا کہ شام کو بند کباب کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم دونوں پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا تھا اور لوگ حیرت سے ہمیں دیکھتے رہ جاتے تھے کہ کیا ان کا دماغ چل گیا ہے۔

انسانی معاشروں میں امیر غریب کی تفریق اور آویزش غالباً انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں ہی شروع ہو گئی تھی اور پھر جیسے جیسے معاشرے نے ترقی کی یہ خلیج بھی بڑھتی چلی گئی جس کے واضح ثبوت نہ صرف سمیری بابلی اشوری مصری ہندو پارسی کنعانی یونانی اور رومی آثار قدیمہ سے ہی ملتے ہیں بلکہ آسمانی کتابوں توریت زبور انجیل اور قرآن سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور قرآن پاک میں تو اس سلسلے میں بڑے واضح اصول و احکامات موجود ہیں جن پر عہد سعادت اور عہد خلافت راشدہ میں عمل کر کے ساری دنیا کو ایک زریں فلاحی معاشرے کا جگمگاتا نمونہ دکھا دیا گیا تھا اور اگر آج بھی ان اصولوں اور احکامات پر حسن نیت اور خلوص سے عمل کیا جائے تو دنیا ایک بار پھر وہی سنہرا نظارہ دیکھ سکتی ہے بہرحال امیر غریب کی یہ تفریق و آویزش انسانی معاشرے کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے اثرات شعر و ادب پر بھی ہمیشہ مرتب ہوتے رہے ہیں اور جس کی مثالیں فارسی اور اردو کے نثری اور شعری ادب میں عام ہیں جہاں زر پرستی کے خلاف عام آواز اٹھائی جاتی رہی ہے اور ذخیرہ اندوزی اور احتکار کے خلاف کھل کر تلقین کی جاتی رہی ہے اور ساتھ ہی انسان دوستی کی بھی تعلیم دی جاتی رہی ہے اور ہر طرح کے ظلم کو روکنے اور برا سمجھنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے مگر ۱۹۳۶ء میں اردو ادب ایک بالکل نئے تجربے سے دوچار ہوا یہ تجربہ ترقی پسند تحریک کا قیام تھا اس تحریک کی ادب میں ابتدا ایک دھماکے کے ساتھ شروع ہوئی جس کا نام انگارے تھا اور ان انگاروں کی آنچ نے دیکھتے دیکھتے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا انسان دوستی، بے غرضی، جاگیرداری، سرمایہ داری، غربت، بھوک، ظلم و ستم، غلامی، آزادی یہ سارے موضوعات صدیوں سے ادب کا حصہ بنتے چلے آئے تھے مگر ترقی پسند تحریک نے ان موضوعات کو ایک نیا جارحانہ لہجہ عطا کر کے انہیں وقت کی آواز بنا دیا اور ہمہ گیر مقبولیت بخش دی تھی ان کے ساتھ ہی جب سلطانی جمہور کا دلفریب نعرہ زبان زد خاص و عام ہوا تو عوام ایک نئی روشن چکیلی صبح کے انتظار میں بے چین اور بیتاب ہو گئے اور کسی خیالی جنت اور یوٹوپیا کی بشارت نہیں تھی بلکہ اس کے لئے بڑی چالاکی اور چابکدستی سے سوویت یونین کو کمیونسٹ نظام کی دلکش جنت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا سوویت یونین مزدوروں اور کسانوں کی جنت جہاں عظیم باپ اسٹالن دودھ اور شہد کی نہروں پر بیٹھا ہوا اسی دنیا میں فوز و فلاح بانٹ رہا تھا یہ وہی سوویت یونین تھا جو اپنے نظام کے ناقابل برداشت بوجھ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ماضی کا افسانہ بن چکا ہے اور وہاں کے مزدوروں اور کسانوں نے کمیونسٹ نظام کے جبر و استبداد سے تنگ آکر خود ہی اسے زمیں بوس کیا ہے مگر ترقی پسند تحریک پروپیگنڈے کے فن سے بخوبی واقف تھی چنانچہ اس کے کارپردازوں نے نہ صرف یہ کہ سوویت

یونین کی ظلم و جبر سے کراہتی ہوئی سرزمین کو اپنے پروپیگنڈے سے جنت بنا کر دکھادیا تھا (اگر کسی کو شک ہو تو فیض مرحوم کی سہ و سال آشنائی پڑھ لے) بلکہ اسٹالین جیسے چنگیز و ہلاکو کو عظیم باپ نمبر دو کی سند پر بھی بٹھادیا تھا اس تحریک نے جو کام کئے سو کئے مگر اس کا سب سے اہم کارنامہ ادب کی دنیا سے مذہب کو بالخصوص اسلام کو رخصت کرنا تھا کیونکہ کمیونزم کی شریعت میں مذہب افیون تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک کے سارے ادب کو پڑھ جائیں اس بیس برس کے عرصے میں ادب میں آپ کو سب کچھ ملے گا اگر نہیں ملے گا تو مذہب نہیں ملے گا ہاں مذہب کی تحقیر ضرور ملے گی پاکستان بننے کے بعد اگرچہ کچھ مذہب پسندوں اور کچھ اسلام پسندوں نے اس صورتحال کے خلاف آواز اٹھائی اور تحریک بھی چلائی مگر ان کا دائرہ اتنا محدود تھا کہ کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آسکی میں اس کو ابن صفی کا سب سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کہ انہوں نے عوامی سطح پر سب سے پہلے اس مسئلے پر کاری ضرب لگائی اور ٹو ویوڈا سلسلے کے اپنی جاسوسی دنیا کے ناول میں نادر کا کردار پیش کر کے ساری ادبی دنیا کو چونکا دیا۔ نادر جو غنڈہ تھا بلکہ جرم کی جدید زبان میں گینگسٹر تھا اور کوئی برائی ایسی نہیں جس کے دھبے نادر کے دامن پر نہ ہوں وہ سرتاپا بدیوں کا مجسمہ تھا مگر یہ نادر جب ایک دن سرورِ کائنات ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر طائف اور فتح مکہ کے واقعات اتفاقاً "ایک دن سنتا ہے اور رسول پاک" کے اسوہ حسنہ سے آشنا ہوتا ہے تو نیکی کا وہ ٹھکرایا ہوا فراموش کردہ ریزہ جو اس کے دل میں چھپا ہوا تھا انگڑائی لے کر ایک دم جوان ہو جاتا ہے اور اسے سرتاپا تبدیل کر دیتا ہے اب وہ برائیوں کی جگہ نیکیوں کا مجسمہ بن کر دنیا کے سامنے آتا ہے اور دنیا کی کوئی تخویف یا تحریص اسے استقامت کی راہ سے ہٹانے سے قاصر ہے ابن صفی کے اس دھماکے نے جو بالکل غیر متوقع طور پر کسی ادب کی کتاب کے بجائے جاسوسی کے ایک ناول کے ذریعے سامنے آیا تھا اردو ادب کو ہلا کر رکھ دیا اگرچہ شروع شروع میں بہت مخالفت بھی ہوئی اور مذاق بھی اڑایا گیا مگر سچائی اور حقیقت اپنی جگہ خود بنالیتی ہیں آج کے اردو ادب میں جو دین کا بول بالا ہے اور اسلامی ثقافت کا جو چرچا ہے اور شعری مجموعے جس طرح حمدوں سے مظہر اور نعتوں سے جگمگاتے رہتے ہیں سچ پوچھئے تو میں اسے ابن صفی کا ہی صدقہ جاریہ سمجھتا ہوں۔

ماہر نفسیات

مشہور ماہر نفسیات "ڈاکٹر ایڈلر" احساس کمتری کے متعلق اپنا نظریہ بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

جسمانی طور پر معذور یا کمزور افراد اکثر وہ کام اختیار کرتے ہیں جو ان کی معذوری یا کمزوری کے برعکس ہوتا ہے۔ مثلاً" ضعف تنفس کے شکار لوگ لمبی دوڑ جیتنے میں لکنت میں مبتلا افراد گلوکار یا خطیب بن جاتے ہیں کمزور آنکھوں والے مصوری کا میلان رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے لیکچر ختم کیا اور حاضرین سے کہا۔

"اگر وہ چاہیں تو اس ضمن میں سوال کریں"

سماعت گاہ کے عقبی حصے سے کوئی بولا۔

"ڈاکٹر ایڈلر! آپ کے نظریہ کا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ ضعف دماغ میں مبتلا لوگ ماہر نفسیات بن جاتے ہیں۔

محمد انور باری۔ کوہ مری

ابھی بات ترقی پسند تحریک کی ہو رہی تھی یہ فقط ایک ادبی تحریک ہی نہیں تھی بلکہ اس کے ڈانڈے ان زیر زمین تحریکوں سے ملے ہوئے تھے جن کے ذریعے سوویت یونین، ایشیا، افریقہ اور وسطی امریکہ کے نو آزاد ملکوں کو اپنے حیطہ اقتدار میں لینے کے لئے کوشاں تھا (حوالے کے لئے پڑوسی ملک کی مسلسل باڑی تحریک اور ۶۵ء کی انڈونیشیا کی بغاوت) لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا اس نے اپنی ان کاوشوں پر سلطانی جمہور کا دل کش و پر فریب پردہ ڈال کر دنیا کی نگاہوں کو ایسا خیرہ کر رکھا تھا کہ کوئی بھی پس پردہ چھپی ہوئی سنگین اور تلخ حقیقتوں کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھا جب تک کہ گردن میں پھندہ پڑ ہی نہ جائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین، کوریا، ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا، کوسٹاریکا، ہانڈوراس، بولویا، کیوبا، گھانا، موزمبیق اور ایتھوپیا وغیرہ میں ہی کمیونسٹ اور سوشلسٹ حکومتیں ہی قائم نہیں ہوئیں بلکہ وہ ممالک بھی سرخ ہو گئے جن کا اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھ تھا جیسے الجزائر، لیبیا، مصر، یمن، شام اور عراق وغیرہ

یہ تو وہی بات ہوگئی کہ چو کفراز کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ ہمارے اپنے پاکستان پر بھی جانے والے جانتے ہیں کہ ایک ایسا وقت آن پڑا تھا وہ تو کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا اور وہ وقت ٹل گیا ورنہ یار لوگوں نے سبز پاکستان کو سرخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس گمبھیر وقت کا سامنا کرنے میں بھی ابن صفی صف اول میں سینہ سپر تھے انہوں نے پے در پے اپنے کئی ناولوں میں نہ صرف اس مسئلے کو اٹھایا بلکہ اپنے لاکھوں قارئین کے ذہنوں کو مدافعت کے لئے تیار بھی کیا انہوں نے نہ صرف مسئلے کی نشان دہی کی بلکہ ان ریشہ دوانیوں کا بھی بڑی چابکدستی سے پردہ فاش کیا جو سفارتی ہتھکنڈوں سے ثقافتی سرگرمیوں کے پردے میں کی جارہی تھیں یہاں میں آپ کی خدمت میں ابن صفی کی ایک دھماکہ خیز غزل پیش کررہا ہوں جو شاید ان کے مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے کیونکہ وہ ان کی کتاب پاگلوں کی انجمن میں استاد محبوب نرالے عالم کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ ذرا اس کی پر معنی طنز اور اس کی تشبیہوں اور استعاروں پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ابن صفی کا سینہ کیسے دینی جوش سے پُر تھا اور اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر کس طرح انہوں نے اپنے عہد کی خوفناک زہرناکی کا مقابلہ کیا۔

اک دن جلالِ جُبّہ و دستار دیکھنا
اربابِ مکر و فن کو سرِدار دیکھنا
سنتے رہیں کسی بھی دریدہ دہن کی بات
ہم بھی کھلے تو جوششِ گفتار دیکھنا
قرآن میں ڈھونڈتے ہیں مساوات احمریں
یارو نیا یہ فتنہ اغیار دیکھنا
وردِ زباں ہیں خیر سے آیاتِ پاک بھی
ہے اہرمن یہ خرقہ و پندار دیکھنا
کل تک جو بت کدے کی اڑاتا تھا دھجیاں
اس کے گلے میں حلقۂ زنار دیکھنا
لائی گئی ہے لال پری سبزہ زار پر
ہوتے ہیں کتنے لوگ گناہ گار دیکھنا
فرصت ملے جو لال حویلی کے درس سے
اک بوریہ نشیں کے بھی افکار دیکھنا

ذکر استاد محبوب نرالے عالم کا آگیا ہے تو دو چار باتیں ان کے بارے میں بھی سہی کیوں کہ عام لوگ اور نئی نسل اور خصوصاً کراچی کے باہر کے لوگ استاد محبوب نرالے عالم کو محض ابن صفی کے ایک کردار ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ استاد کو بھی من جملہ فریدی حمید عمران سلیمان جوزف ظفر الملک اور جیسن وغیرہ کے ایک کردار ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ استاد کیا قیامت چیز ہیں۔ دنیا کے اکثر بڑے لکھنے والوں کی جب تعریف کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ان کے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں مگر جب ان جیتے جاگتے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ انہیں مصنف کی مقصدیت نے تخلیق کیا ہے اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ فی الواقعی بہت سے ایسے کرداروں کے پیچھے کچھ جیتی جاگتی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں لکھنے والا اپنے مطلب کا پاکر منتخب کرتا ہے اور ان کا بغور معائنہ و مطالعہ کرکے اپنی مقصدیت کے پیش نظر ان پر اتنا چونا گارا لگا دیتا ہے کہ اصل خدوخال کا پہچان لینا مشکل ہوجاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی علم کے حوالے سے ابن صفی کے کئی دوستوں اور جاننے والوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ ابن صفی کے کس کردار کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں مگر وضاحت کے ساتھ انگلی رکھنا ممکن نہیں ہے خود ان کے ایک دو کرداروں پر بعض وقت مجھے خود اپنا گمان گزرا ہے۔ لیکن یہ غالباً پوری دنیا کے ادب میں صرف ابن صفی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایک پورا زندہ، جیتا، جاگتا آدمی عادتوں، خصلتوں اور خوبو سمیت اپنا کردار بنا کر اپنے قلم کی نوک کے ذریعے اردو ادب کے سینے میں اتار دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے کسی طرح کی رنگ آمیزی کا ایک برش بھی اس کے چہرے پر نہیں لگایا ہے۔

ناظم آباد چورنگی پر واقع ابن صفی کا دفتر ایک ایسی بارگاہ تھی جہاں بیٹھ کر بڑی آسانی سے بھانت بھانت کا آدمی دیکھا جاسکتا تھا۔ وہاں اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے والے بھی آتے تھے اور ہم جیسے چھٹ بھیئے بھی۔ ان آنے والوں میں ادب و شعر کے جغادری بھی ہوتے تھے اور وہ بے پڑھے لکھے رکشے والے بھی جو دوسروں سے پڑھوا کر ابن صفی کی کتابیں سن لیا کرتے تھے۔ ان میں وہ عالی ہمت بھی ہوتے تھے جنہوں نے محض ابن صفی کو خود پڑھنے کے شوق میں لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ صرف ان لوگوں کے چہرے دیکھ کر اور ان لوگوں کی باتیں سن سن کر آدمی اگر چاہے تو بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ کرداروں کے اس اجتماع ضدین کو دیکھ کر بعض اوقات ابن صفی پر بڑا ترس آنے لگتا تھا کہ اکثر جی نہ چاہنے کے باوجود اور خلاف طبیعت باتیں سن کر بھی اپنی طبیعت کی شرافت کے ہاتھوں انہیں ان لوگوں سے گفتگو کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ان کی کتابیں طبیعت کی خرابی کے علاوہ اکثر اسی واسطے لیٹ ہوتی تھیں کہ کتاب لکھنے کا سارا وقت انہیں ملنے والوں کی

نذر کر دینا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجلا کر اس طرح کے ملاقاتیوں پر پابندی لگانے کے بارے میں سوچتے تھے مگر ان کی طبیعت کی مکساری اور شرافت ہمیشہ اس طرح کے اقدام میں مانع رہی اور اگر وہ پابندی لگا بھی دیتے تو ہم جیسے بے تکلف ڈھیٹ لوگوں کا کیا کرتے۔

عام طور سے سن مجھے یاد نہیں رہتا اس لئے عموماً زمانہ یاد کرنے کے لئے میں مخدومی مشتاق احمد یوسفی کے فارمولے پر عمل کرتا ہوں۔ یا تو ایوب خان کا آخری زمانہ تھا یا یحییٰ خان کا ابتدائی دور تھا۔ ایک دن سہ پہر کو ابن صفی کے دفتر پہنچا تو ایک عجیب و غریب شخصیت کو ان کے پاس براجمان دیکھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور کراچی کی گرمیاں تو آپ جانتے ہی ہیں کتنی پسینہ آور ہوتی ہیں مگر وہ صاحب سخت گرم موسم کے باوجود گرم پتلون اور گرم شیروانی میں ملبوس تھے، پیروں میں کھسہ تھا اور سر پر سوار ہیٹ تھا۔ پاس ہی ٹین کا بنا ہوا ایک بگل نما بھونپو بھی تھا۔ موصوف کا کلین شیو گہرا سانولا چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا اور وہ کچھ عجیب استغراق کے عالم میں کرسی پر دھرے ہوئے تھے۔

یہ استاد محبوب نرالے عالم تھے اگرچہ ہم اسی وقت تک ان کی ذات و الا صفات سے واقف نہیں تھے مگر ابن صفی ان کو دریافت کر چکے تھے اسی لئے موصوف ان کے پاس ہی دھرے ہوئے تھے۔ ابن صفی کو ایسی نادر روزگار شخصیات دریافت کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ استاد محبوب نرالے عالم اپنی قسم کی واحد شخصیت اور بڑے بے دھڑک اور بے پناہ شاعر تھے، ادب میں بڑے بڑے اساتذہ گزرے ہیں مگر اتنا لمبا چوڑا تخلص آج تک کسی مائی کے لال کو نصیب نہیں ہوا۔ استاد کا فرمان تھا کہ وہ بڑے شاعر ہیں اسی لئے وہ تھے ورنہ اگر وہ کوئی اور فرمان جاری کر ڈالتے تو ان کا کیا جا سکتا تھا۔ جوش اور جگر سے خود کو بڑا شاعر سمجھتے تھے بلکہ جوش صاحب سے تو خصوصی طور پر شاکی تھے کیونکہ استاد کا خیال تھا کہ جوش صاحب ان کے ذہن میں گھس کر اکثر ان تخلیقات کو اڑا لیا کرتے تھے جو ہنوز پردۂ عدم سے استاد کے دماغ کے عرصۂ وجود پر نازل بھی نہیں ہو سکتی تھیں حوالے کے لئے وہ جوش صاحب کی نظم گلبدنی کو پیش کیا کرتے تھے جو جوش صاحب نے استاد کے ذہن میں نقب لگا کر سرقہ کر لی تھی اگر جوش صاحب یہ نہ کرتے تو اب تک استاد کی "گلبدنی" مکمل ہو کر منصہ شہود پر آ چکی ہوتی اور جوش صاحب ہی کیا بقول استاد یہ حرکت ان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے غالب بھی ان کے ساتھ کر چکے تھے استاد شاعری میں انفرادیت کے قائل تھے اور اپنی انفرادیت کے ثبوت میں اپنے کلام کی بے وزنی کو پیش کرتے تھے۔ استاد کا کہا ہوا تقریباً "ہر شعر بے وزن ہوتا تھا اب اس سے بڑھ کر استادی اور انفرادیت کا اور کون سا ثبوت ہو سکتا تھا۔ استاد میں یہ مرض بھی تھا کہ اکثر ان میں دوسرے بڑے شاعروں کی روح حلول کر جاتی تھی اور جب بھی ایسا ہوتا تھا۔ تو ان ارواح کے فیض سے استاد کچھ باوزن شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ یعنی باوزن شعر کہنے میں قصور استاد کا نہیں بلکہ استادوں کی روحوں کا تھا جو زبردستی استاد کے جسم میں حلول کر کے انہیں مجبور کر دیا کرتی تھیں۔ اردو کے تمام بڑے اساتذہ کی طرح استاد بھی غم روزگار کا شکار تھے گویا یہ بھی ان کے استاد اور بڑے شاعر ہونے کی مزید دلیل تھی لیکن انہوں نے غم روزگار پر آہیں بھرنے شکوے کرنے یا تیرے میرے قصیدے کہہ کر پیٹ پالنے کے بجائے ایک عوامی دھندا اپنا لیا تھا (یہ واقعی ان کی عظمت کی دلیل تھی مگر وہ خود اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے) ان کا یہ دھندا "چنا جور گرم" بیچنا تھا جسے وہ "چنا کڑک" کہتے تھے۔ جب اندھیری راتوں میں بھونپو کو منہ سے لگا کر اپنی پاٹ دار آواز میں استاد چنا کڑک کی صدا لگاتے تھے تو دور دور سے شائقین کھنچے چلے آتے تھے۔ استاد "محبوب نرالے عالم" ہی نہیں تھے "محبوب خلائق" بھی تھے ان کی شاعری کے شائقین کی تعداد چنا خوروں سے بھی زیادہ تھی اس لئے استاد کو اکثر جو بھی عقیدت مند پاجاتا بڑی طرح دبوچ لیتا اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ سننے سنانے کے چکر میں استاد ہفتوں دھندے سے دور رہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے موقعوں پر اکثر استاد کے قدرداں ان کے کام آتے تھے اور خود ابن صفی بھی استاد کے ایک بڑے قدرداں تھے۔ بعد میں استاد نے مزید ترقی کر ڈالی۔ سوندے سوندے چنے بیچنے چھوڑ دیئے۔ لمبی چوڑی سرسید ٹائپ ڈاڑھی رکھ لی۔ پہلے نجومی بنے پھر عامل کامل اور آخر میں پیر بن گئے مگر وہ الگ قصہ ہے جو پھر کبھی سنایا جائے گا۔

بہرحال ہم ابن صفی کے دفتر میں داخل ہوئے تو استاد کو وہاں براجمان پایا۔ اس وقت تک ہم ان سے واقف نہیں تھے بس نام سن رکھا تھا۔ استاد کی وہاں موجودگی ہمیں کچھ اچھی نہیں لگی کیونکہ ہم تو ابن صفی کو اپنی تازہ غزل سنانے گئے تھے۔ ہم نے کرسی گھسیٹتے ہوئے ابن صفی سے اشارے سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ ہماری اس حرکت سے استاد کا استغراق ٹوٹ گیا انہوں نے اپنی چمکتی ہوئی سرخ سرخ

آنکھوں سے ہمیں گھور کر دیکھا۔ ہم تعارف کے منتظر تھے مگر ہمیں جواب دینے کے بجائے ابن صفی ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ استاد کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا۔

"کہیئے۔ کیا کچھ نزول ہو گیا استاد"

غالباً "جو ہنگامہ ہمیں استاد کی موجودگی میں تازہ غزل سنانے کے بارے میں تھی وہی ہماری موجودگی میں استاد کو بھی لاحق تھی لہٰذا استاد نے پہلے تو ہم دونوں نیاز مندوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی پھر کچھ دیر اس طرح منہ اوپر اٹھائے رہے جیسے آسمان میں اڑتی ہوئی چیل دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر تھوڑی دیر تک ناک بھوں پر زور دیتے رہے جو ان کی خاص ادا تھی پھر جھوم کر بڑی گرج دار آواز میں بولے۔

"سنیئے صفی صاحب۔ دیکھئے کیا چیز ہو گئی ہے
حسن کو آفتاب میں ضم ہو گیا ہے
عاشق کو ضرور بے خودی کا غم ہو گیا ہے

"جواب نہیں ہے استاد۔ کیا آفتاب میں ضم باندھا ہے کہ بالکل بند کر رہ گیا ہے" ابن صفی نے داد دی "اجی یہ کیا چیز ہے" استاد انکساری سے بولے "پچھلی رات اچانک مجھ میں غالب کی روح حلول کر گئی۔ بڑے بڑے سوال جواب ہوئے میں نے غالب کی روح کو للکار دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ۔

تم بھلا باز آؤ گے غالب
راستے میں چڑھاؤ گے غالب
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

"مگر یہ تو وزن دار ہے استاد" ابن صفی نے اعتراض کیا

"ارے صاحب میں نے کہا نا کہ غالب کی روح حلول کر گئی تھی۔ میں کیا کرتا۔" استاد نے بڑی بے نیازی سے وضاحت کی۔ اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چلا تھا۔ مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ابن صفی سے پوچھ ہی لیا۔

"بھئی یہ کون صاحب ہیں۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ"

"ارے یار۔ تم انہیں نہیں جانتے" میرے اشتیاق کو دیکھ کر ابن صفی نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا

"نہیں بھائی۔ میں واقف نہیں ہوں" میں نے کہا

"یہ ہیں امام الجاہلین قتیل ادب استاد محبوب نرالے عالم نہ طلبہ" ابن صفی نے تعارف کرایا اور پھر استاد کی طرف دیکھ کر بولے

"اور استاد یہ اپنے شاہد منصور ہیں۔ شاعری کرتے ہیں" میں نے اس تعارف پر اور خصوصاً "امام الجاہلین کے لقب پر بہت گھبرا کر استاد کی طرف دیکھا مگر استاد نے ابن صفی کے تعارف پر ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی تھی (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عبارت تو استاد کے وزنگ کارڈ پر بھی چھپی تھی) استاد نے مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولے۔

"تو آپ ہیں شاہد منصور۔ ایک دن آپ کو اردو بازار میں کرمانی بھائی کی دکان پر دیکھا تھا۔ ارے صاحب میں کیا اور میرا تعارف کیا میں تو ارتعاش سمگاں کا دشت لامکاں میں مقیم مصلوب ہوں"

اس عجیب و غریب جملے کو سن کر مارے حیرت کے میرے منہ سے "جی" کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکا۔ اگرچہ میں نہیں سمجھ سکا مگر ابن صفی سمجھ گئے تھے کیوں کہ وہ استاد کے مزاج شناس ہی نہیں بلکہ ذہن شناس بھی تھے انہوں نے فوراً ہی استاد کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور ان کا ہدف تلاش کر لیا جو دو نوجوان لڑکیوں پر مشتمل تھا جو سامنے سے آ رہی تھیں۔ ابن صفی کو معلوم تھا کہ استاد پر ایسے نامانوس کڈھب بے معنی الفاظ بولنے کا دورہ اسی وقت پڑتا ہے جب آس پاس کوئی صنف مخالف محو خرام ہو۔ اتنے میں دو دونوں نوجوان خواتین ہاتھوں میں آٹوگراف بک سنبھالے دفتر میں داخل ہوئیں اور ابن صفی سے آٹوگراف کی خواستگار ہوئیں جب تک وہ دفتر میں موجود رہیں ایسا لگا کہ استاد کی زبان اور نگاہ دونوں کو پالا مار گیا مگر ان کے جاتے ہی استاد نے ایک جھرجھری لی اور بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ابن صفی کی طرف جھک کر بولے۔

"صفی صاحب۔ انسانی تہذیب کی مہذباتی اور سکونی مناکحت بہت ضروری ہے۔ غالب وذوق وغیرہ نے بلکہ مومن نے بھی مشروباتی الکحلیات کی تفصیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر تجریدی ضابطے کی اشتراکیت مشروتی الحراب کی سند نہیں ہو سکتی"

اس جناتی جملے کو سن کر ابن صفی جھوم کر بولے

"واللہ استاد۔ آپ نے تو اپنی نثری گفتگو میں صفت مستول البلمازیہ پیدا کر دی ہے۔ بھئی بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں"۔ پھر میری طرف مڑ کر بولے "آپ کو معلوم ہے شاہد صاحب کہ استاد کا واسطہ کس عظیم خانوادے سے ہے"

صاف ظاہر ہے کہ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے بڑی مسکینی سے انکار میں سر ہلایا تو بولے۔

"بھئی دراصل استاد کا لکھنؤ کے سلطان واجد علی شاہ اختر اور دہلی کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے براہ راست نسبی تعلق ہے اسی لئے عنقریب استاد قیصر باغ لکھنؤ اور لال قلعہ

دہلی کی ملکیت واگزار کرنے کے لئے بھارتی حکومت کو نوٹس دینے والے ہیں مگر ان کا حقیقی رشتہ مغلوں کے مورث اعلیٰ ڈغال خان سے ہے اگرچہ بیچ میں کہیں نادر شاہ درانی اور نوشیروان عادل بھی آجاتے ہیں۔"

بڑی حیرت سے میرے منہ سے نکلا "ڈغالی"

اور استاد بڑی محبوب مسکراہٹ کے ساتھ بولے

"نہیں صاحب نہیں۔ وہ ڈغالی اور ہوتے ہیں۔ میرے مورث اعلیٰ ڈغال خان تھے جو فاتح عالم چنگیز خان کے دادا زاد بھائی تھے اور انہیں کے بہنوئی کے نواسے کے ماموں کے داماد سکندر اعظم تھے۔"

میں سوائے سر ہلانے کے اور کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کہا بھی کیا جا سکتا تھا مگر ابن صفی بھانپ گئے کہ میں کس بری طرح پھٹ پڑنے کے لئے بے قرار ہوں لہٰذا انہوں نے فوراً ہی موضوع بدل دیا اور استاد سے وہ چنا کڑک سنانے کی فرمائش کی جسے سنا کر انہوں نے پی ای سی ایچ سوسائٹی کے مکینوں بلکہ حسینوں کو لوٹ لیا تھا۔ استاد کو کیا عذر ہو سکتا تھا انہوں نے فوراً اپنا بھونپو اٹھایا اور پاٹ دار آواز میں شروع ہو گئے۔

"پی ای سی ایچ کے حسین
میرے جتنے سے نمکین
بولے بھائی خیر الدین
پاپڑ ایک آنے کے تین
چنا کڑک"

سناتے سناتے اچانک استاد رک گئے۔ بھونپو ہاتھ سے رکھ دیا اور شیروانی کے دامن سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مجھ سے بولے۔

"شاہد صاحب یہ تو سیدھی سادی اردو ہے۔ اس میں آپ کو کیا مزہ آیا ہوگا اگر کبھی آپ میری فارسی سنیں تو پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ استاد کی شاعری کیا چیز ہے۔"

"فارسی" میری آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ابن صفی ہلکا سا کھنکارے "ارے بھئی حیرت کی کیا بات ہے۔ فارسی اور عربی تو استاد کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ اچھا بھئی عربی پھر کبھی سہی۔ استاد آپ شاہد صاحب کو فارسی سنا ہی دیں یہ بھی کیا یاد کریں گے۔"

اور استاد تو جیسے منتظر ہی بیٹھے تھے فوراً ہی کان پر ہاتھ رکھ کر شروع ہو گئے مگر شکر ہے اس مرتبہ انہوں نے بھونپو ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔

"نظر خمی خمی، نظر گمی گمی، نظر سمی سمی

دھمک سنگ فروں فضا فروغی جیا لم لم
عشر خوشگی خمر عشر فشاں نمو زوم یروم
قلی وقل دلی و قل قو تمی قتا قلم، قلم،
نظر خمی خمی نظر گمی گمی نظر سمی سمی"

پھر بارگاہ ابن صفی میں کچھ اور لوگ آگئے محفل کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔ پھر کئی مہینے گزر گئے۔ ابن صفی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ استاد بھی اس درمیان ایک دو بار ملے مگر کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی پھر ابن صفی کی مشہور کتاب ڈاکٹر دعا گو چھپ کر آگئی۔ اس کی قسطیں حریت اخبار میں چھپتی رہی تھیں مگر میں نے نہیں پڑھی تھیں لہٰذا جب کتاب ملی تو بڑے ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیا اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس کتاب میں میں نے استاد محبوب نرالے عالم کو من و عن اسی طرح براجمان پایا جیسے وہ مجھے ابن صفی کے دفتر میں براجمان ملے تھے۔ اپنی تمام تر ہیئت کذائی، شکل و صورت، لباس اور بھونپو اور مکالموں کے ساتھ کوئی بھی فرق تو نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ قدرت نے استاد کو ابن صفی کا کردار بننے کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔

اب ایسا اور ڈھونڈھ کے لائیں کہاں سے ہم
ابن صفی کی بات تو اہل صفا کی تھی

"رشتہ"

تیز و طرار لڑکی اسپتال کی نرس کے پاس گئی اور بولی نرس میں ڈاکٹر اسد سے ملنا چاہتی ہوں!

نرس نے قدرے نرمی سے پوچھا! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کون ہیں!

... میں لڑکی کچھ گھبرا سی گئی! میں ان کی بہن ہوں! نرس نے جلدی سے ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی! میں اسد کی بڑی بہن ہوں!

خالدہ پروین